بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

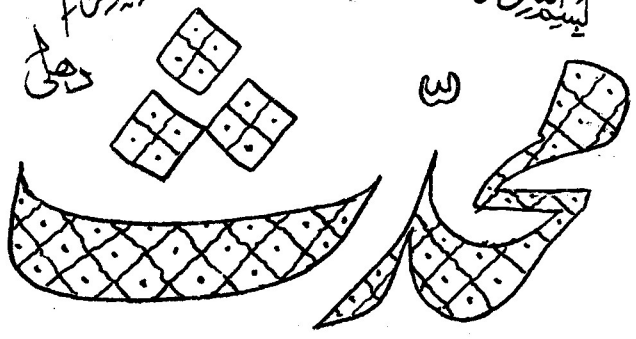

محدث

دہلی

نمبر ۳	بابت ماہ جولائی ۱۹۳۸ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ	جلد ۶

درد و کرب کی غم انگیز داستان

(از نذیر احمد املوی رحمانی ایڈیٹر رسالہ محدث دہلی)

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

حکیم مشرق سر اقبال مرحوم پر ماتم کرنے والوں کے نالہ وشیون کی آوازیں ابھی کانوں میں گونج ہی رہی تھیں کہ قدرت نے ایک اور چرکہ لگایا۔ ابھی یہ زخم کاری مندمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دل کی گہرائیوں میں رنج والم کا ایک دوسرا ناسور پیدا ہوگیا۔ ابھی اس ہم وغم کی چبھن باقی ہی تھی کہ درد وکرب کی ایک دوسری ٹیس پیدا ہوگئی۔ ابھی ہم سفینۂ علم وحکمت کے ڈوب جانے کا ماتم ہی کر رہے تھے کہ گنجینۂ دولت وثروت، خزینۂ جود وسخا بھی ہم سے چھن گیا۔ یعنی وحی الٰہی کا خادم، رسول عربی کا عاشق، وقت کا سخی، زمانے کا حاتم، بیواؤں کا سہارا، یتیموں کی آس، غریبوں کی مراد، بے کسوں کی پناہ، دار الحدیث رحمانیہ دہلی کے مہتمم، رسالہ محدث کے مالک عالیجناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب تقریباً آٹھ روز تک صاحب فراش رہ کر یکم ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق یکم جون ۱۹۳۸ء بروز بدھ کی رات میں ½۱۱ بجے کے قریب، اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اعلیٰ علیین کو سدھار گئے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون ؀

قدرت نے مرحوم کو وہ دل دیا تھا جس میں رحم وکرم لطف وعطا اور غربا پروری کا جذبہ روز اول ہی سے کارفرما تھا

اور جاننے والے اسے جان بھی رہے تھے لیکن ۱۹۲۱ء میں جبکہ ملت کا شیرازہ منتشر، علم دین کی بے قدری، طالبان علم کی بے سرو سامانی، قرآن حکیم کی تعلیمات سے بیزاری، احادیث نبویہ کی ضیا باریوں سے بے توجہی کا احساس آپ کے اور آپ کے برادر بزرگ حاجی عبدالرحمن صاحب مرحوم غفراللہ لہ ورحمہ کے دردمند دلوں میں پیدا ہوا۔ اور پھر ان دونوں کی متفقہ حوصلہ مندیوں سے دارالحدیث رحمانیہ جیسی عظیم الشان مستقل علمی درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی۔ تو اس وقت سے دنیا نے خاص طور پر آپ کو پہچاننا شروع کیا۔ اور پھر اسی سال آپ کے بڑے بھائی حاجی عبدالرحمن صاحب مرحوم جب اپنے رب سے جا ملے۔ اور مدرسہ کے اخراجات کا بار گراں تنہا آپ کے کندھوں پر ڈال گئے، تب تو دنیا کے سامنے آپ اس شان سے نمایاں ہوئے کہ آج مرنے کے بعد آپ کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ آپ کو خلق خدا، دین اور علم دین کی خدمات کا جتنا موقعہ ملتا گیا، اتنا ہی آپ کے اس جذبے میں ترقی ہوتی گئی۔ اور آہستہ آہستہ یہ فیض اتنا بڑھا کہ آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ حجاز و نجد، شام و عراق، مصر و یمن، سندھ و سماٹرا، چین و جاوا، رنگون و آسام غرض مشرق و مغرب شمال و جنوب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جہاں اس مرد خدا کا دست کرم کسی نہ کسی نوعیت سے نہ پہنچا ہو، اور کوئی ایسی جماعت نہیں جو اس کی بخشش و عطا سے بالکل ہی محروم رہی ہو۔

حقیقت حال سے ناواقف حضرات ممکن ہے میری اس تحریر کو مبالغہ سمجھیں، لیکن میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اس میں قطعاً مبالغہ نہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ صرف اپنا ہی مدرسہ اس کے اخراجات کا مرکز تھا، یا صرف رسالہ محدث ہی کے ذریعہ وہ دین و ملت کی خدمتیں انجام دے رہا تھا۔ نہیں نہیں بلکہ کم و بیش ایک ہزار روپیہ ماہانہ خود اپنے مدرسہ کے خرچ کے علاوہ، مبلغین کی تنخواہیں تبلیغی کتابوں اور رسالوں کی اشاعت، دوسرے مدارس اور تبلیغی انجمنوں و یتیم خانوں کی امداد وغیرہ تو ایسے مصارف ہیں جنکو ہم بھی جانتے ہیں۔ لیکن اس کے سوا اس کے اخراجات کی بہت سی مدیں تو ایسی خاموش اور خفیہ تھیں کہ بمطابق حدیث نبوی لَا تَعْلَمُ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ یعنی دائیں ہاتھ سے خرچ کرتا ہے اور بائیں کو خبر نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جاڑے کے موسم میں چار چار اور پانچ پانچ سو لحاف اور کمبل بنوائے اور خریدے جاتے ہیں اور پھر خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں تقسیم ہو جاتے تھے۔ رشتے کی بیواؤں اور غریبوں کے علاوہ، محلے کے محتاجوں اور شہر کے ناداروں کو بھی نہیں بھولتے تھے رومال میں ہر وقت روپے بندھے ہوتے تھے اور حسب موقع اور حسب توفیق دن بھر اس میں سے ضرورتمندوں پر خرچ کرتے رہتے تھے اور خصوصاً ان سفید پوش مصیبت زدوں پر زیادہ توجہ رکھتے تھے جو باوجود ناداری اور انتہائی غربت کے اپنی شرافت اور غیرت کے باعث کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ مدتوں یہ دستور رہا کہ ہفتہ میں ایک روز شہر کے غریب بچوں میں پیسے تقسیم کرتے تھے۔ جب یہ دن آتا تو بچوں کا ایک جم غفیر مدرسہ کے سامنے آکر جمع ہو جاتا اور تقریباً گیارہ بجے مرحوم کے آنے کے وقت ان کی موٹر کا ہارن سنکر اک شور برپا ہو جاتا، اور بچے مسرت کے مارے اچھلے پڑتے۔ موٹر سے اتر کر پیسوں کی تھیلی ہاتھ میں لیکر خود اپنے ہاتھوں سے ایک طرف سے سب کو بانٹنا شروع کر دیتے اور انتہا یہ ہے کہ وہ بچے جو کسی اسکول یا مدرسہ میں پڑھنے جاتے تھے اور عام تقسیم کے وقت نہ پہنچ سکتے تھے۔ ان کا حصہ الگ محفوظ رکھدیتے۔ اور جب شام کو چار بجے وہ واپس آتے تو پھر ان کے حصے کے پیسے ان کو دیدیتے۔

لیکن آہ! داد و دہش کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، آج یکایک رک گیا۔ مظلوموں اور بے کسوں کے سروں سے رحمت یزدانی کا یہ مبارک سایہ اچانک اٹھ گیا۔ پس یہ غم میرا ہی غم نہیں بلکہ ملت کا غم، قوم کا سوگ اور جماعت کا ماتم ہے ؎

آعندلیب! مل کے کریں آہ و زار یاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ کا افتتاح شوال ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اور اسی سال تقریباً دو مہینے کے بعد ذی الحجہ میں میں مدرسہ میں بغرض تعلیم داخل ہوگیا۔ ابتدا سے انتہا تک اپنی دینی تعلیم کا بیشتر حصہ یہیں مکمل کرنے کے بعد شعبان ۱۳۴۶ھ میں میں نے مدرسہ سے سند فراغت حاصل کی۔ اور پھر اسی سال مدرس کی حیثیت سے مدرسہ کی خدمت پر مامور ہوگیا۔ اور اب تک بحمداللہ اسی درجے پر فائز ہوں۔ اس اٹھارہ سالہ زندگی میں شاید ایک آدھ سال میں مدرسہ سے غیر حاضر رہا۔ ورنہ اکثر حصہ اسی گلشن علم کی بلبلوں، باغ حکمت کے پھولوں، اور ریاض ملت کی کیاریوں میں گذارا ہے۔ اس درمیان میں محترم مرحوم کے لطف و کرم کی بدلیاں، میری جسمانی و روحانی اصلاح و فلاح، نجاح و بہبود کیلئے، مجھ پر جس طرح جھوم جھوم کر برسی ہیں، بخدا اس کے شکریے کیلئے اگر میرے جسم کا ایک ایک بال، اور رگوں میں دوڑنے والے خون کا ایک ایک قطرہ مجسم دعا بنجائے، تب بھی کبھی اس کا معاوضہ نہیں بن سکتے۔ اللہ، اللہ جس کے فیض نے جہل و نادانی کی تاریک گہرائیوں سے نکالکر، علم و ہدایت، عزت و رفعت کے بلند میناروں پر پہنچا دیا ہو، بھلا اس کا معاوضہ کسی انسانی طاقت کے بس میں ہے؟ مجھے فخر ہے کہ میرے رب نے مجھے رحمانیہ کی خدمت کی توفیق بخشی، اور میں نے اپنے محترم محسن کی شفقت و محبت کے زیر سایہ رہ کر، اپنی علمی ترقیوں کے بہت سے مدارج طے کرلئے۔ لیکن کاش قدرت نے کچھ اور مہلت دی ہوتی، تو نہ معلوم ہم کہاں سے کہاں پہنچتے۔ محترم مرحوم کو مجھ عاجز اور میرے محترم دوست مولانا عبیداللہ صاحب کے ساتھ خاص انس تھا۔ انس ہی نہیں بلکہ دلی محبت اور قلبی تعلق تھا۔ ان کی یہ ہمیشہ تمنا اور خواہش رہی کہ وہ ہمیں عروج و ترقی کے بلند سے بلند مقام پر دیکھیں۔ لیکن وائے قسمت! ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد ٭ روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

قارئین! ابتک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ مرحوم کے مالی ایثار و قربانی سے متعلق تھا۔ لیکن ان کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو اس سے بہت زیادہ اہم، اور زمانے کے لحاظ سے نہایت تعجب خیز اور عبرت انگیز ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج دنیا میں دولت کا غرور، ثروت کا نشہ ایک طرف اگر اللہ کے غریب بندوں پر حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے۔ تو دوسری طرف خود خدا سے بھی آمادۂ پیکار رہتا ہے۔ یہ تجوریوں کے مالک ہی نہیں کہ حاجتمندوں اور فاقہ مستوں ہی کو دھتکار دیتے ہوں، بلکہ اسلام اور شعائر اسلامی کا بھی مضحکہ اڑاتے ہیں۔ طالبانِ دین کو ساتھ بٹھانا تو درکنار، ان سے بات بھی کرنا اپنی ہتک اور باعث عار سمجھتے ہیں۔ لیکن مدرسہ رحمانیہ کا مرحوم مہتمم اپنے اس اخلاقی کیرکٹر اور دینی اسوہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھا۔ پنجگانہ نمازوں میں پابندیٔ جماعت کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ جبکہ یہ اللہ کا بندہ باوجود عیش و عشرت کے جملہ اسباب فراہم ہونے کے بھی، رات کے

اس حصے میں جبکہ تمام آبادی پر سناٹا چھایا ہو لوگ نرم گدوں یا پھول کی سیجوں پر مصروف راحت ہوتے۔ اور رات بھر کی سرمستیوں کا خمار ان کو دبوچے ہوتا، تو اللہ کا یہ مخلص بندہ اپنے رب کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتا۔ مالک کی یاد میں لگا رہتا۔ نمازیں پڑھتا اور دعائیں کرتا رہتا تا آنکہ جب صبح صادق کا وقت قریب ہوتا تو اس خیال سے کہ فجر کی نماز اول وقت ڈیڑھ میل پیدل چلکر مدرسہ میں پہنچتا اور ایک طرف سے سب کو نہایت شفقت و محبت سے، کسی سے یہ کہکر "اٹھو بیٹے نماز پڑھ لو" اور کسی کان میں یہ آواز ڈالکر کہ "چلو بھائی نماز پڑھ لو"، جگانا شروع کرتا۔ اور ایک بار نہیں، بلکہ دو دو تین تین چکر لگا کر مدرسے کے ایک ایک فرد کو اٹھاتا۔ اور کبھی کسی پر اس لئے ناراض نہیں ہوا کہ تم باوجود بار بار آواز دینے کے بھی جلدی کیوں نہیں اٹھتے اور یہ نہیں کہ دو چار مہینے یا سال دو سال کر کے چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس کو جاری رکھا۔ آندھی آئے یا بدلی ہو، سردی ہو یا سخت گرمی اس وظیفے کو کبھی ترک نہیں کیا۔ یہ مرد خدا خود پابند شرع تھا اور اپنے ہر ماتحت کو پابند شرع دیکھنا چاہتا تھا۔ کبھی کسی کا پاجامہ ٹخنے سے نیچے دیکھا تو اس پر ٹوکا کبھی کسی کی نماز میں غفلت دیکھی تو اس پر تنبیہ کی۔ الغرض وہ عالم تو نہ تھا لیکن عملی حیثیت سے بہت سے علماء کے لئے نمونہ تھا۔ غفر اللہ لہ ورحمہ

اخلاق کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ہر روز صبح کی نماز پڑھکر جب گھر واپس جاتے، اور پھر دس، گیارہ بجے مدرسہ میں آتے تو بغیر کسی تکلف کے ایک کھری چارپائی پر بیٹھ جاتے۔ اور شام تک انھیں غریبوں اور بے وطن طالب علموں کے ساتھ خوش خوش باتیں کرتے رہتے۔ جنھیں دنیا حقارت سے ٹھکرا دیتی ہے۔ ہر ایک کی خیریت پوچھتے۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ اور حتی الوسع کسی کو یہ حسرت پیدا ہونے کا موقع نہیں دیتے کہ ہم پردیس میں ہیں۔ اگر کبھی کسی کو کوئی رنج دہ حادثہ پیش آتا تو اُسے بلا کر، ایسی دل بہلاوے کی باتیں کرتے جس سے اس کا غم غلط ہو جاتا۔ خود بھی نہایت زندہ دل انسان تھے، اور زندہ دلی ہی کو پسند کرتے تھے تقشف اور خشک مزاجی اونھیں نہیں بھاتی تھی۔ دن رات مدرسہ ہی کا خیال رہتا اور ہمیشہ طلبہ و مدرسین ہی کی خاطر و مدارات کی فکر میں رہتے چنانچہ اپنی اس آخری بیماری میں بھی وفات سے دو روز پیشتر جب مولانا محمد صاحب عیادت کے لئے گئے، تو اپنی کمزور آواز میں سب سے پہلے طلبہ کی خیریت اور مدرسہ کا حال پوچھا۔ الغرض مرحوم کی شخصیت اپنی ممتاز خصوصیات کے لحاظ سے ایک مغتنم ہستی تھی۔ جس کی ذات سے بڑی بڑی ملی و قومی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن حیف! ع

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

مرحوم کی اہم یادگاروں میں سب سے بڑی اور مستقل یادگار مدرسہ رحمانیہ ہے۔ جس کا دائمی اجر انشاء اللہ ان کے رفع درجات کا سبب بنے گا۔ مرحوم نے آج سے دو سال پیشتر ہی اس کی تولیت کا حق اپنے منجھلے صاحبزادے عالیجناب حاجی شیخ عبدالوہاب صاحب وَفَّقَہُ اللّٰہُ وَ بَارَکَ کے حوالہ کر دیا تھا۔ جو اپنی فطری قابلیت اور طبعی مستعدی، نیک دلی اور خوش اخلاقی کے باعث ہر طرح اسکے اہل بھی ہیں امید ہے کہ انکے ساتھ ان کی معاونت و تائید میں انشاء اللہ انکے بڑے بھائی جناب حافظ فضل الرحمن صاحب اور چھوٹے بھائی خانصاحب جناب شیخ حبیب الرحمن صاحب میونسپل کمشنر آنریری مجسٹریٹ بھی ہر طرح انکا ساتھ دینگے اور اس اہم ذمہ داری کے نباہنے

۴۴ وقت پر طلبہ اور علما کے ساتھ ادا کرتے۔ تقریباً ۳ بجے رات کو اکیلا گھر سے نکل پڑتا اور